ہر اتوار کو روزنامہ اسلام کے ساتھ شائع ہوتا ہے

بچوں کا اسلام

۱۱۶۹

اتوار ۱۱ رجب المرجب ۱۴۴۶ھ
مطابق ۱۲ جنوری ۲۰۲۵ء

پاکستان کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا بچوں کا مقبول ترین ہفت روزہ

دس روپے

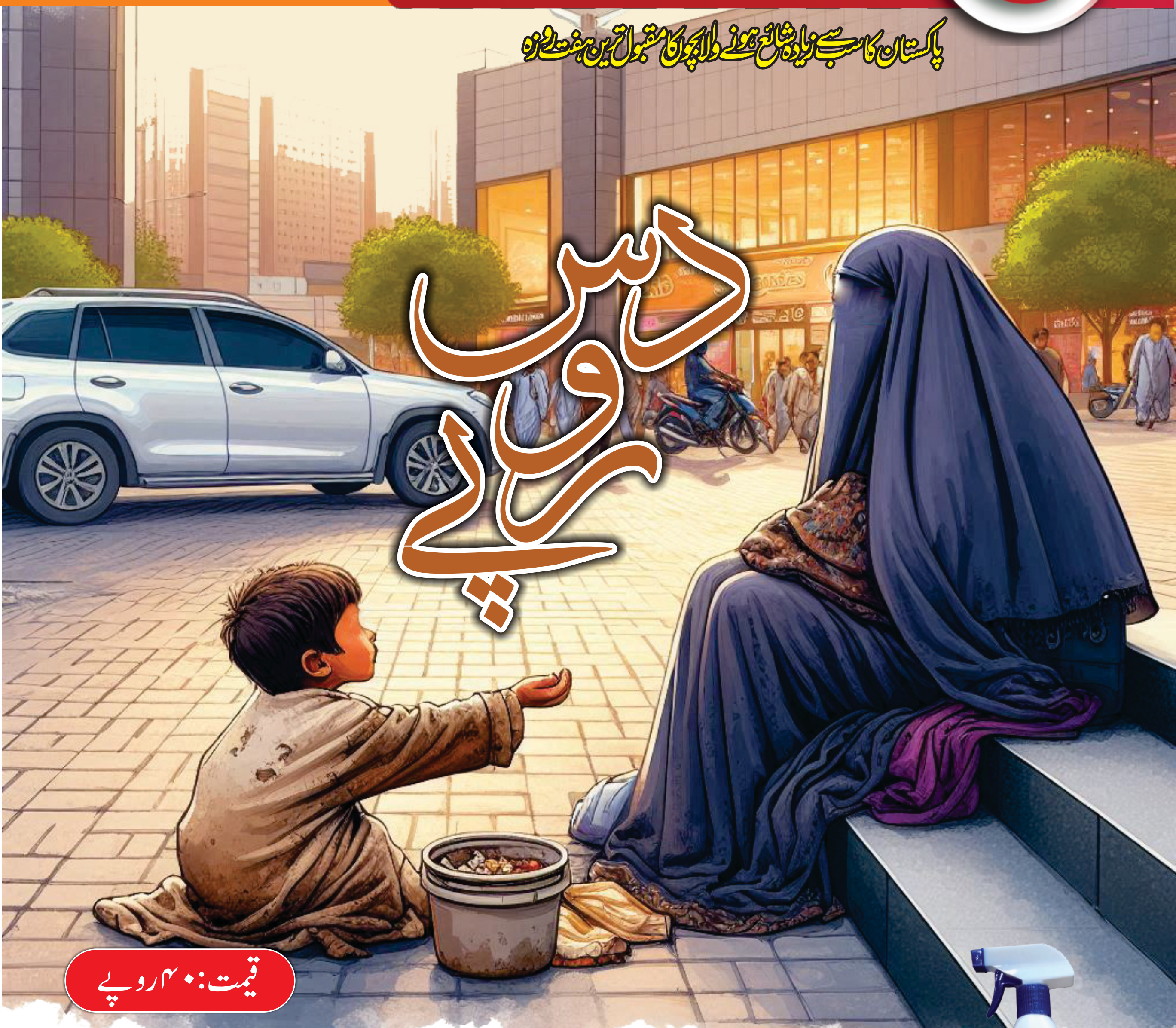

قیمت: ۴۰ روپے

aci
Blood Bgone
Blood Stain Remover
خون کے دھبے مٹانے کا واحد اسٹین ریموور
LADIES WEAR | CLOTHING | BEDSHEETS | CARPETS / SOFA
Imtiaz پر دستیاب ہے

القرآن

وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ

آپ کہہ دیجیے کہ میں لوگوں کے پروردگار، لوگوں کے مالک اور لوگوں کے معبود کی پناہ میں آتا ہوں، وسوسہ ڈالنے والے اور پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے، جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے (خواہ) وہ جن میں سے ہو یا انسان میں سے۔

(سورۃ الناس)

الحدیث

عذاب سے پناہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے:

’’اے اللہ! میں عذاب قبر اور جہنم کے عذاب سے تیری پناہ میں آتا ہوں، زندگی میں آزمائش اور موت کی سختی سے پناہ چاہتا ہوں اور مجھے دجال کے فتنے سے محفوظ فرما۔‘‘

(بخاری)

کیا، کیوں، کیسے؟

ابن بہروز

چاند کا ہالہ کیا ہے؟

بعض اوقات چاند کے گرد روشنی کا ایک بڑا سا حلقہ دیکھنے میں آتا ہے۔ جب یہ چیز دکھائی دے تو آپ سمجھ لیں کہ ایک ہلکا سا بادل جو چھوٹے چھوٹے صاف شفاف برف کے ریزوں سے بنتا ہے، ہوا میں تیر رہا ہے۔ جب چاند کی کچھ شعاعیں برف کے ان شفاف ریزوں کے درمیان میں سے گزر کر سیدھی آپ کی آنکھوں تک پہنچتی ہیں تو آپ کو چاند دکھائی دیتا ہے لیکن جب دوسری شعاعیں ان ریزوں سے ٹکراتی ہیں تو سیدھی جانے کے بجائے خم کھا جاتی ہیں۔ پھر جب آپ کی آنکھوں تک پہنچتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی ایسے حلقے سے نکل رہی ہیں جو چاند سے بہت بڑا ہے۔ اسی حلقے کو ہالہ کہتے ہیں۔ ایسا ایک حلقہ بعض اوقات سورج کے گرد بھی نظر آتا ہے اور اس کی بھی یہی وجہ ہوتی ہے۔

دُم دار ستارہ کیا ہے؟

یہ ستارہ ایک دہکتی ہوئی گیند کی طرح ہوتا ہے اور اس کی ایک لمبی سی چمکتی ہوئی دُم بھی ہوتی ہے۔ یہ اصل میں برف کا گولہ ہوتا ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ پرانے زمانے میں گیس کے ذرات، گرد و غبار کے بادل اور پانی کے قطرے فضا میں ایک جگہ اکٹھے ہو گئے اور اُنھوں نے کسی طرح برف کے گولوں کی شکل اختیار کر لی۔ ان گولوں پر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو وہ چمک اُٹھتے ہیں۔ دُم دار ستارے فضا میں سفر کرتے ہیں۔ بلکہ اکثر ستاروں کے سورج کے گرد باقاعدہ راستے بنے ہوئے ہیں۔

شہاب ثاقب کیا ہے؟

شہاب ثاقب چٹان یا کسی دھات کے بڑے بڑے ٹکڑے ہوتے ہیں جو فضا میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ صاف شفاف راتوں میں آپ کم از کم ایک چمک دار شہاب ثاقب ضرور دیکھ سکتے ہیں لیکن دُم دار ستارے کو دیکھنے کے لیے دوربین کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوئی شہاب زمین کے قریب پہنچتا ہے تو زمین اسے اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن ہوا کی رگڑ لگنے سے وہ گرم ہو جاتا ہے اور پھر اس میں آگ لگ جاتی ہے۔ اکثر شہاب ثاقب ہوا ہی میں جل جاتے یا پھٹ جاتے ہیں۔ کچھ زمین پر بھی گرتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں رات کے وقت سائبیریا کے اوپر بھی ایک چیز پھٹی تھی۔ جس نے سیکڑوں میل میں پھیلے ہوئے جنگل کو جلا کر بھسم کر دیا تھا۔ اس کے پھٹنے سے تقریباً آدھی دنیا میں روشنی پھیل گئی تھی۔ لیکن سائنسدانوں کا خیال ہے کہ وہ شہاب نہیں دُم دار ستارہ تھا۔

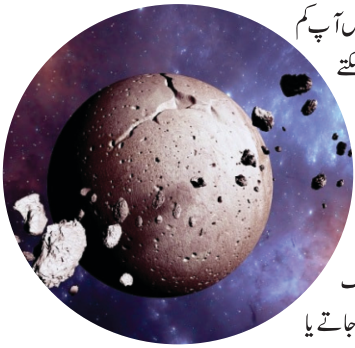

کیا اُڑن طشتریاں واقعی کوئی وجود رکھتی ہیں؟

آسمان پر بہت سی عجیب و غریب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جب موسم بالکل صاف ہو تو فضا میں روشنی کے حلقوں کو کچھ لوگ اُڑن طشتریاں سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ طشتریاں نہیں ہوتیں اور نہ ہی یہ اُڑتی ہیں۔ جب ہوا میں برف کے صاف شفاف ریزے تیر رہے ہوں تو ان پر سورج کا عکس پڑتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ طشتریاں اُڑ رہی ہیں۔ سائنسدان موسمی تبدیلیوں کا کھوج لگانے کے لیے بعض آلات کو پلاسٹک کے غباروں کے ذریعے فضا میں بھیجتے ہیں۔ جب سورج کی روشنی کسی غبارے پر پڑتی ہے تو کوئی پراسرار قسم کی اُڑن طشتری لگتی ہے۔ اگر زمین کے نزدیک ٹھنڈی ہوا کی تہہ ہو اور اوپر گرم ہوا کی تہہ ہو تو ایک عجیب منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ گرم تہہ آئینے کا کام دیتی ہے اور جب دور فاصلے پر دوڑتی ہوئی موٹر کار کی روشنیوں کا عکس اس پر پڑتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فضا میں طشتری اُڑ رہی ہو۔

اے وقت

ایمن مسلم پڑا۔ صادق آباد

بعض لوگ وقت کو جان سے عزیز رکھتے ہیں اور انھیں ہر لمحے اسی کا خیال رہتا ہے، البتہ ہم نے کبھی اسے جوتی کی نوک پر بھی نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج تک کامیاب ہیں اور لوگ ہم پر رشک کرتے ہیں۔ یقیناً آپ کو بھی آرہا ہوگا۔ ہمارے جیسے بننے کے لیے آپ ہمارے نادر و نایاب خیالات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ہم وقتِ موصوف کی کون کون سی خامیوں کو جھٹلائیں۔ وقت اس قدر خود غرض ہے کہ اسے کسی بوڑھے کے آرام، بچے کی خواہشات اور جوانوں کی عیش بھری زندگی کا کوئی خیال نہیں۔

یہ اس قدر بدتمیز ہے کہ نہ کسی کی سنتا ہے اور نہ مانتا ہے، چاہے لاکھ منت کرڈالو، ہر وقت چلتا ہی رہتا ہے۔ دن، رات، صبح و شام کوئی لمحہ ایسا نہیں کہ سکون سے بیٹھ جائے، بدتمیز کہیں کا۔

لوگ کہتے ہیں کہ وقت کی قدر کرو۔ اب بھلا آپ ہی بتائیں ہم ایک ایسی چیز کی قدر کیسے کرسکتے ہیں، جو ہمیں کبھی ملا ہی نہیں۔ قدر تو اسی چیز کی ہوتی ہے جو کبھی ملی ہو۔ ہم نے تو اسے کبھی سکون سے بیٹھا کر نہیں دیکھا۔ یہ ہر وقت تیز رفتار گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑتا رہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں جو وقت کی قدر نہیں کرتا، ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں جو وقت کی قدر نہیں کرتا، وہ زندگی کی دوڑ میں آگے نکل جاتا ہے۔

وقت بہت بے حس ہے، جب کوئی غم کا موقع ہوتا ہے تو یہ ہماری بے بسی کا تماشا دیکھنے کے لیے رک جاتا ہے اور جب ہمیں کوئی خوشی ملے تو پھر اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہے جیسے چور چوری کر کے۔

اے وقت! کبھی تو ہمارا احساس کرلیا کر۔ ہماری بات سن لے کبھی۔ اگر تو اپنے بے لگام گھوڑے سے چند لمحوں کے لیے اتر آئے تو کون سی قیامت آجائے۔ لگتا ہے، تجھے بھی اس شعر کی بھنک پڑ گئی ہے۔

یہ دنیا مقامِ بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

اسی لیے تو موت سے ڈر کر ہر لمحے بھاگتا رہتا ہے، اتنی محنت کرتا ہے، رہا تو پھر بھی وقت کا وقت ہی۔

ارے! یہ کیا، لگتا ہے وقت رک گیا۔ چند لمحے پہلے بھی صبح کے پانچ بجے تھے اور اب بھی۔ شاید اسے بھی ہمارا خیال آ ہی گیا۔ وقت تھم گیا ہے۔ چلو جلدی سے تھوڑا سا آرام کرلو، پھر اسکول بھی جانا ہے۔'' دل نے کہا۔

ہم نے دل کی بات مان لی جب کافی دھوپ نکل آئی تو ہم اطمینان سے تیار ہو کر اسکول کی طرف خراماں خراماں چل دیے۔

ہوش تو ہمارے تب اڑے جب کلاس میں استانی صاحبہ کے چہرے پر ہمیں دیکھ کر سخت غصے کے آثار ابھرے۔

''اوہو آیئے، آیئے، آپ ہی کا تو انتظار فرما رہے تھے ہم شہزادی صاحبہ۔''

انھوں نے طنز کے تیر برسائے۔

ہم خوشی سے پھولے نہ سمائے اور بولے۔ ''جی جی! ضرور بتایئے کیا بات ہے؟''

ہمارے اس بھول پن پر استانی مزید غصے میں آگئیں اور ہماری وہ درگت بنی کہ آج تک نہیں بھولے اور ہم وقت کو کوستے ہوئے اپنی سیٹ پر چل دیے۔ گھر آکر پتا چلا کہ صرف گھڑی رکی تھی، وقت نہیں رکا تھا۔

''اے وقت! تو نے ہماری زندگی میں بہت سے نقصانات کیے۔ ان سب کی تلافی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ تو بھاگنا چھوڑ دے اور دھیرے دھیرے چلا کر، مگر وہ وقت ہی کیا جو کسی کے کہنے پر اپنی رفتار کم کرلے!!!

☆☆☆

حامد کرتارپوری

اے خدا

ذکر تیرا ہی تو ہر دم اے خدا کرتے رہیں
ہم پہ لازم ہے تری حمد و ثنا کرتے رہیں
تو ہی خالق ہے ہمارا اور رزاق بھی ہے تو
تیرے در پر ہی ہمیشہ ہم صدا کرتے رہیں
کچھ نہیں بنتا ہے یارب تیری رحمت کے سوا
اس لیے تیرے کرم کی ہم دعا کرتے رہیں
ہاں وہی اک نام جو محبوب ہے تجھ کو بہت
ہم اسی اک نام پر یہ جاں فدا کرتے رہیں
سرخ رو ہم ہوں گے تبھی میرے مولا حشر میں
شاملِ حالات گر تیری رضا کرتے رہیں
ہو گیا اپنا غلامانِ محمد میں شمار
شکرِ رب ہم ہر گھڑی اور جا بجا کرتے رہیں
ہے تمنا روزِ حشر گر نبیؐ کا ساتھ ہو
تو زباں پر ورد ہم صلِ علیٰ کرتے رہیں
ہو کے سجدہ ریز ہم بھی اپنے خالق کے حضور
حامدؔ اس کی نعمتوں کا حق ادا کرتے رہیں

☆☆☆

خط کتابت کا پتا: دفتر روزنامہ اسلام، ناظم آباد، کراچی bkislam4u@gmail.com, 021 366 099 83

ادارہ روزنامہ اسلام کی تحریری اجازت کے بغیر بچوں کا اسلام کی کوئی تحریر کہیں شائع نہیں کی جاسکتی۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کرنے کا حق رکھتا ہے۔

سالانہ زرتعاون: اندرون ملک 2000 روپے بیرون ملک ایک میگزین 25000 روپے دو میگزین 28000 روپے انٹرنیٹ www.dailyislam.pk

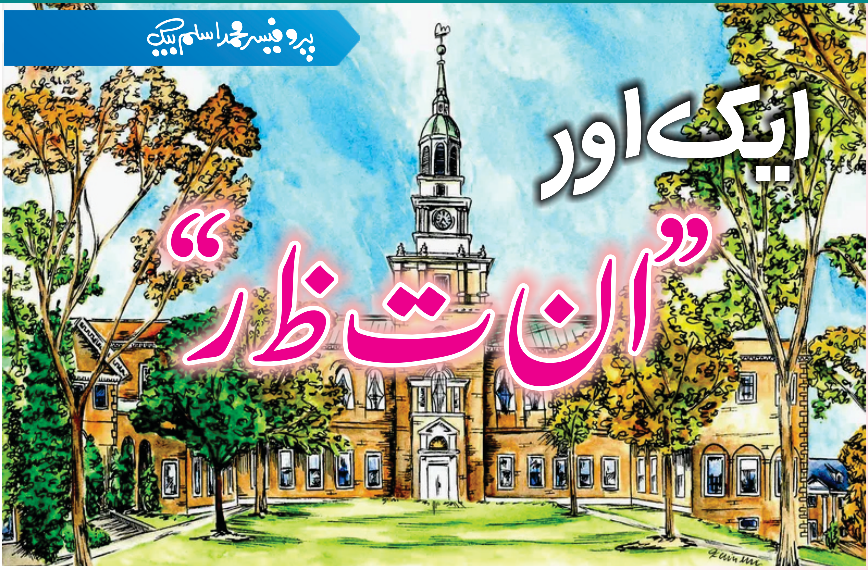

ایک اور ”ان ت ظ ر“

پروفیسر محمد اسلم بیگ

”ان ت ظ ر“ کی کیفیات کا ایک روپ آپ جون ۲۰۲۴ء کے دوشماروں ۱۱۴۰ اور ۱۱۴۱ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ وہ انتظار ایک ہی شہر کے نو (۹) کلومیٹر دور واقع ایک اسکول سے گھر کے قریب ایک اسکول میں ٹرانسفر کے بعد ریلیو ہونے کے صبر آزما لمحات کے بارے میں تھا۔ انتظار کا یہ دوسرا انداز آٹھ سو (۸۰۰) کلومیٹر دور شہر کے ایک کالج سے ایک قریبی شہر کے کالج میں تبادلے اور پھر ریلیو ہونے کے بظاہر ناممکن واقعات پر مشتمل ہے۔ انتظار کے یہ دونوں لمحات موسمِ گرما کے تپتے دنوں کی یادگار ہیں اور دونوں میں انتظار کا اِختتام موسمِ گرما کی تعطیلات کے دوران ہی ہوا۔

آج سے چوالیس (۴۴) سال پہلے کی بات ہے۔ میں راولپنڈی سے ایک طویل سفر کے لیے ٹرین پر سوار ہوا۔ میری منزل صادق آباد تھی۔

سخت گرمی کے دن تھے اور جوں جوں سفر آگے بڑھ رہا تھا، گرمی کی شدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ پسینہ کئی بار آیا اور خشک ہوا۔ سفر کے آخری چند گھنٹے ریگستانی علاقے میں طے ہوئے جس سے جسم اور لباس پر ریت کی تہہ جم گئی۔

۳۰ اپریل ۱۹۸۰ء کو صبح چاشت کے وقت ایک پُر مشقّت سفر کے بعد صادق آباد (بہاولپور) ریلوے اسٹیشن پر اترا تو سورج کی حِدّت نے میرا استقبال کیا جس سے تھکن کی شدت اور بوریت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

میں نے یہ طویل سفر بادلِ نخواستہ شروع کیا تھا اور اَب پلیٹ فارم پر اتر کر چڑھتے سورج کی اُترتی روشنی میں اپنی خستہ حالت دیکھ کر اپنے او پر ترس آ رہا تھا۔ میں اِس قابل نہیں تھا کہ اس حُلیے کے ساتھ کسی سرکاری دفتر میں پہلی مرتبہ حاضری دے سکوں۔ مجھے گورنمنٹ کالج صادق آباد میں لیکچرر کی حیثیت سے اپنی نئی ملازمت کا آغاز کرنا تھا۔

صادق آباد بہاول پور ڈویژن کی ایک بڑی تحصیل اور کاروباری مرکز کے علاوہ ایک تاریخی شہر بھی ہے۔ یہ پنجاب کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے۔ اس کے بعد صوبہ سندھ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ صادق آباد راولپنڈی اسلام آباد سے تقریباً ۸۰۰ کلومیٹر دور ہے۔

تقرر نامہ میں نے بڑی بے دلی سے پڑھا کیونکہ راولپنڈی اور صادق آباد میں بہت زیادہ فاصلہ تھا اور اس وقت ریل پر چودہ پندرہ گھنٹے کا مسلسل سفر تھا۔ شدید گرمی کی وجہ سے ملازمت کے لیے یہ شہر پرکشش نہیں تھا۔

اُس وقت میں راولپنڈی کے ایک گورنمنٹ ہائی اسکول میں سائنس ٹیچر تھا۔ تنخواہ اور ٹیوشنز وغیرہ سے ماہانہ تین سے چار ہزار روپے تک آمدنی ہو جاتی تھی اور اسکول بھی گھر سے صرف چند منٹ پیدل کے فاصلے پر تھا۔ اُس کے مقابلے میں لیکچرر کی اس وقت تنخواہ صرف نو سو روپے ماہانہ تھی۔ اپنے گھر کا آرام چھوڑ کر اتنی دور جانا مجھے گھاٹے کا سودا لگ رہا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی تقرری کی خبر صرف گھر والوں تک محدود رکھی۔ اسکول میں اس کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ دو ہفتے یوں ہی گزر گئے اور میں بدستور اپنا کام کرتا رہا۔

ایک دن میرے پہلے خالی پیریڈ میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور سوالیہ انداز میں بولے:

”آپ کو یہ خبر ہے کہ آپ کی تقرری بطورِ لیکچرر ہو چکی ہے؟“

ان کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

”جی مجھے تقرر نامہ ملا تھا۔“

”پھر تو بہت مبارک ہو پروفیسر صاحب! لیکن آپ نے مجھے یا اسکول میں کسی کو اطلاع کیوں نہیں دی؟“ انھوں نے لفظ ’پروفیسر صاحب‘ بڑی گرم جوشی سے بولا تھا۔

”میں جانا نہیں چاہتا۔“ میں نے ’پروفیسر صاحب‘ کا لفظ بے یقینی سے سنا۔

”حیرت ہے، آپ اس خوش خبری اور اپنی خوش بختی کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے؟ لوگ تو ایسے مواقع پر مٹھائی لا کر سب کا منہ میٹھا کراتے ہیں اور اپنی خوشی میں سب کو شریک کرتے ہیں۔“

”جناب! اگر یہ تقرری راولپنڈی یا اس کے کسی قریبی شہر میں ہوتی تو میں ضرور خوش ہوتا لیکن صادق آباد جیسی جگہ جانے کو بالکل جی نہیں چاہتا، لیکن آپ کو یہ خبر کس نے دی؟“

”صادق آباد کالج کے پرنسپل صاحب کا فون آیا تھا اور وہ پوچھ رہے تھے کہ آپ نے ابھی تک آ کر جوائن کیوں نہیں کیا؟ اُن کے پاس آپ کا تقرر نامہ پندرہ دن پہلے سے آیا ہوا ہے۔“

”پھر تو یہ اپ کے پاس بھی آیا ہوگا!“ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے دریافت کیا۔

”ضابطے کے مطابق تو میرے پاس بھی آنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے ڈاک میں اِدھر اُدھر ہو گیا ہو، ورنہ اگر مجھے ملا ہوتا تو میں پندرہ دن تک اسے اپنے پاس لے کر بیٹھا نہ رہتا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے پرنسپل صاحب نے مجھے فون کر دیا ورنہ آپ تو اپنی نادانی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ سنہری موقع ضائع کر دیتے۔“

”سر! میں اِس پر بہت سوچ بچار کر چکا ہوں اور مجھے وہاں جانے میں فائدے کم اور نقصان زیادہ نظر آ رہے ہیں، مجھے زیادہ کی تمنا نہیں ہے۔“

”آپ کی سوچ محدود اور تجربہ کم ہے۔ آپ جسے قناعت سمجھ رہے ہیں یہ دراصل کفرانِ نعمت ہے۔ آپ اللہ کا شکر ادا کریں کہ آپ کو یہ سنہری موقع مل رہا ہے۔ آپ یہ موقع ضائع نہ کریں اور جا کر فوری طور پر لیکچرر کا چارج سنبھالیں۔“

”ممکن ہے آپ کی بات درست ہو لیکن مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔“

صدقۂ جاریہ

جامعۃ الرشید

زیر تعلیم طلبہ کرام کے

ماہانہ اخراجات
اپنے ذمہ لیجئے

ایک طالب علم کا ماہانہ خرچ 20,000 روپے

دو طلبہ کرام کا ماہانہ خرچ 40,000 روپے

پانچ طلبہ کرام کا ماہانہ خرچ 100,000 روپے

دس طلبہ کرام کا ماہانہ خرچ 200,000 روپے

https://jtr.edu.pk/donate

0322 2000 644

میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''بیگ صاحب! آپ ایک بہت قابل استاد ہیں اور میرے دل میں آپ کی بہت قدر ہے، اِس لیے میں آپ کو مخلصانہ اور ہمدردانہ مشورہ دے رہا ہوں کہ آپ وقتی نقصان اور گھر کے آرام کو نہ دیکھیں۔ بہتر مستقبل پر نظر رکھیں۔ گریڈ ۱۴ کی نوکری کے مقابلے میں آپ کو گریڈ ۱۷ کی نوکری مل رہی ہے۔ اسکول ٹیچر سے آپ کالج کے لیکچرر اور ایک گزیٹڈ آفیسر بننے جا رہے ہیں۔ کل آپ پروفیسر بھی بن جائیں گے اور پھر ضروری نہیں کہ آپ ساری عمر صادق آباد ہی میں رہیں، تبادلے بھی ہوتے رہتے ہیں اور آپ اپنے شہر میں واپس بھی آسکتے ہیں۔ ویسے بھی کامیابی اور ترقی کی منازل گھر بیٹھ کر بادام اور کاجو کھانے سے نہیں بلکہ باہر کے دھکے اور ٹھوکریں کھانے سے طے ہوتی ہیں۔''

میں نے اُن کی اِس بات کا سوائے ہلکی مسکراہٹ کے کوئی جواب نہ دیا۔

''آپ ایک بہت اچھے سائنس ٹیچر ہیں اور سائنس ٹیچر سے کوئی ہیڈ ماسٹر محروم نہیں ہونا چاہتا۔ اگر میں خودغرض ہوتا تو آپ کو یہ مشورہ نہ دیتا لیکن مجھے آپ کے مستقبل کا خیال ہے، اِس لیے آپ ہمت سے کام لیں۔''

انھوں نے مجھے سمجھانے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کردیں۔

اور جب انھوں نے دیکھا کہ میں ان کے دلائل سے متاثر اور قائل نہیں ہو سکا تو انھوں نے یک طرفہ کارروائی کرتے ہوئے مجھے گورنمنٹ کالج صادق آباد میں بطور لیکچرر جوائن کرنے کے لیے اپنے اسکول سے ریلیو کردیا۔

ریلیونگ آرڈر میرے ہاتھ میں تھما کر بولے کہ میں نے آپ کی کشتیاں جلا دی ہیں، اب آپ کے پاس صادق آباد جانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا۔ آپ آج رات کی ٹرین سے روانہ ہوجائیں اور صبح صادق آباد پہنچ کر جوائن کرلیں۔''

اس کے ساتھ ہی انھوں نے فوری طور پر اسٹاف سیکرٹری کو بلا کر چھٹی کے فوراً بعد میری الوداعی پارٹی کا انتظام کرنے کو کہہ دیا۔

جس جس کو پتا لگتا رہا، مجھے مبارکباد دیتا رہا اور میں بے دلی سے جواب دیتا رہا۔ میں جس اطمینان اور سکون سے صبح اسکول پہنچا تھا وہ غارت ہو چکا تھا۔ اپنا شہر چھوڑنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر سفر بھی سوار ہو چکا تھا۔ راولپنڈی کی زمین میرے پاؤں تلے سے نکل چکی تھی۔ اگر میں ان تلووں کو صادق آباد کی گرم ریت کی تپش سے بچا بھی لیتا تو مجھے سرکاری ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

اپریل ۱۹۸۰ء کی آخری صبح کے چڑھتے سورج نے اپنی تمازت کی 'گرم جوشی' سے صادق آباد ریلوے اسٹیشن پر میرا استقبال کیا۔ مستقبل قریب کا یہ 'گزیٹڈ آفیسر' پلیٹ فارم پر اپنے مختصر سامان کے ساتھ اتر کر افسردگی سے اپنی ہیئت کذائی کو دور کرنے کی تدبیر سوچنے لگا۔

صادق آباد میں نہ کوئی رشتے دار تھا نہ دوست یار جس کے گھر جا کر اپنی حالت درست کرتا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ کسی حمام میں جا کر غسل کرلوں۔ اُس زمانے میں ہر زُلف تراش (ہیئر ڈریسر) کی دکان میں غسل کے لیے ایک دو حمام ہوتے تھے، چنانچہ تانگے پر بیٹھ کر شہر پہنچا اور وہاں کے بڑے بازار کے ایک حمام میں غسل کیا۔

اَب میں تازہ دم ہو چکا تھا۔

گورنمنٹ کالج صادق آباد شہر سے باہر کھلی جگہ پر تھا۔ پرنسپل صاحب نے مجھے خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے خوش آمدید کہا۔ اسٹاف سے میرا تعارف کرایا۔ چھوٹا کالج تھا، اساتذہ بھی کم تھے اور طلبہ کی تعداد بھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ پرنسپل صاحب نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار بھی کیا کہ آپ کو اتنی دور سے آنا پڑا۔

پانچ چھے غیر مقامی اساتذہ نے مشترکہ طور پر ایک گھر کرایے پر لیا ہوا تھا، انھوں نے مجھے پیشکش کی کہ جب تک آپ فیملی کو نہیں لاتے اور کوئی گھر کرایہ پر نہیں لیتے ہمارے ساتھ رہیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔

پرنسپل صاحب نے مجھے کہا کہ آپ آج چھٹی کے بعد اُن کے ساتھ جائیں، آج رات آرام کریں۔ کل یا پرسوں آپ واپس راولپنڈی جا کر اپنا سامان لے آئیں، اُس کے لیے میں آپ کو تین چار دن کی چھٹی دے دوں گا۔

شاید انھوں نے میرا مختصر سامان دیکھ لیا تھا۔ شام کو وہ بھی ''چھڑیاں دے ڈیرے'' (اکیلے افراد کا مسکن) پر آ گئے۔ سب سے گھل مل گئے۔ مجھے اُن لوگوں کا بے تکلفانہ ماحول بہت پسند آیا۔

میں جب دوبارہ اپنا سامان لے کر واپس آیا تو انھوں نے ڈیرے کا ایک کمرہ میرے لیے مختص کر دیا۔ تین چار دن کے بعد پرنسپل صاحب نے مجھے میڈیکل فٹنس سرٹیفکیٹ لینے کے لیے بہاول پور بھیجا۔

بی وی ہاسپٹل بہاول پور میں میرا میڈیکل چیک اپ ہوا جو گزیٹڈ آفیسر کے ملازمت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ جسمانی طور پر فٹ قرار دیے جانے کے بعد مجھے سرٹیفکیٹ جاری ہوا جس کی ایک کاپی میں نے کالج کے پرنسپل کو اور دوسری رحیم یار خان جا کر ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفیسر کے پاس جمع کروائی تاکہ تنخواہ جاری ہو سکے۔

ابھی تین چار دن نہیں گزرے تھے کہ وفاقی وزارتِ تعلیم اسلام آباد کی طرف سے ایک خط پرنسپل صاحب کو موصول ہوا کہ سمعی و بصری معاونت کی پندرہ روزہ ورکشاپ کے لیے اپنے ایک لیکچرر محمد اسلم بیگ کو یہاں بھیج دیں۔ اُس میں پاکستان بھر سے انیس بیس اساتذہ کو بلایا گیا تھا۔ ورکشاپ سے فارغ ہو کر صادق آباد واپس پہنچا تو ایک ہفتے بعد موسمِ گرما کی تعطیلات شروع ہو گئیں۔ اِس طرح میں جون کے شروع میں تقریباً اڑھائی مہینے کے لیے واپس راولپنڈی آ گیا۔

اوپر کی چند سطور میں قیامِ صادق آباد کی جو مختصر تفصیل بیان کی ہے اس کا مقصد دراصل یہ بتانا تھا کہ چارج سنبھالنے کے بعد اور تعطیلات سے پہلے جتنے دن صادق آباد میں رہنا پڑا، وہ گنتی کے صرف چودہ پندرہ دن بنتے ہیں۔

موسمِ گرما کی تعطیلات میں اللہ تعالیٰ نے مجھے صادق آباد کی شدید گرمی، لُو کے تھپیڑوں اور غریب الوطنی کی آزمائشوں سے محفوظ رکھا اور اپنے شہر (راولپنڈی) اور اپنے گھر رہنے کی نعمتوں سے نوازا اور اس کے ساتھ ہی مجھے یہ موقع بھی فراہم کر دیا کہ میں صادق آباد سے یہاں یا کسی قریبی شہر تبادلے کے لیے کوشش کر سکوں لیکن اس میں دو بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ایک رکاوٹ یہ تھی کہ ازروئے قانون نئی ملازمت کے ابتدائی دو سال تک تبادلے کے لیے درخواست نہیں دی جا سکتی اور دوسری بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اگر تبادلہ ہو بھی جاتا تو صادق آباد کے پرنسپل صاحب اس وقت تک کسی کو ریلیو نہیں کرتے تھے جب تک اس کی جگہ کوئی متبادل نہیں آ تا تھا، اِس پر وہ بہت سختی سے عمل کرتے تھے اور انھوں نے مجھ پر بھی یہ بات اچھی طرح واضح کر دی تھی۔

کالج کے دیگر اساتذہ نے مجھے بتایا کہ یہاں آ کر شروع میں ہم بھی تبادلے کے بارے میں پُراُمید رہتے تھے لیکن اب ہر ایک کو دو دو تین تین سال ہو چکے ہیں، تبادلے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اِس لیے آپ بھی چھٹیوں کے بعد اپنی فیملی کو یہاں لے آئیں۔ آپ کا تبادلہ کم از کم دو سال تو ناممکن ہے۔

کالج کا کلرک سراج احمد رحمانی بہت محنتی اور ایمان دار نوجوان تھا۔ اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ایم اے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور اس سے تعلیمی تعاون کیا (بعد میں اس نے کالج سے دو سال کے لیے چھٹی لی اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کر لیا اور پھر اسی کالج میں اردو کا لیکچرر بن گیا) اس نے مجھے بتایا کہ آپ جس پوسٹ پر کام کر رہے ہیں اس پر پہلے پروفیسر راجہ محمد اسلم تعینات تھے جو ٹرانسفر ہو کر گارڈن کالج راولپنڈی جا چکے ہیں۔ اُن کے بڑے تعلقات ہیں۔ آپ راولپنڈی جائیں گے تو ان سے ضرور ملیں۔ وہ آپ کے کام آئیں گے۔

موسمِ گرما کی تعطیلات کے دوران میں ایک دن گارڈن کالج چلا گیا۔ میری خوش قسمتی کہ وہ چھٹیوں کے باوجود کالج میں موجود تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو بہت تپاک سے ملے۔ چائے وغیرہ پلا کر مجھے اپنے ساتھ ڈائریکٹر ایجوکیشن کالجز کے دفتر لے گئے جو کالج کے قریب ہی تھا۔ وہاں لوگ اُن سے بہت بے تکلفی سے مل رہے تھے اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی تعلقات عامہ کے ماہر ہیں۔ متعلقہ کلرک نے انھیں بتایا کہ گورنمنٹ کالج مری میں میرے مضمون کی ایک پوسٹ خالی ہے۔ میرے لیے یہ بہت بڑی اور حیران کن خبر تھی کیونکہ دو دن پہلے وہی کلرک مجھے بتا چکا تھا کہ پورے راولپنڈی ڈویژن میں آپ کے مضمون کی کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔

میں نے راجہ اسلم صاحب کا بہت شکریہ ادا کیا اور اگلے دن مری جا پہنچا۔ مری کا کالج اُن دنوں کھلا ہوا تھا کیونکہ وہاں تعطیلات موسمِ گرما کی بجائے موسمِ سرما میں ہوتی ہیں۔ پرنسپل حافظ منظور الحق عثمانی صاحب سے ملا تو معلوم ہوا کہ حسنِ اتفاق سے گورنمنٹ کالج لاہور میں وہ میرے استاد رہ چکے تھے۔

ایک راوین اور اُن کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے میں نے اپنا تعارف کروایا تو بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے تصدیق کی کہ واقعی یہاں ایک پوسٹ خالی ہے۔ میری درخواست پر انھوں نے ایک تحریر مجھے بنوا کر دی جسے ڈی او لیٹر DO Letter (نیم سرکاری خط) کہا جاتا تھا۔ اس خط میں خالی آسامی کی تصدیق کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ اگر محمد اسلم بیگ کو یہاں ٹرانسفر کر دیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ خط مل جانا میری بڑی خوش بختی تھی۔

اِس خط نے مجھ میں ایک نئی توانائی بھر دی اور میں نے ٹرانسفر کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ یہ ٹرانسفر سیکرٹری ایجوکیشن یا ڈی پی آئی پنجاب کے اختیار میں تھی جن کا دفتر لاہور میں تھا۔ ٹرانسفر پر دو سال تک پابندی کی وجہ سے یہ کام بہت مشکل بلکہ ناممکن نظر آ رہا تھا لیکن تمام رکاوٹوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور حیران کن طور پر اگلے ماہ جولائی میں ہی میری ٹرانسفر کے احکام جاری ہو گئے۔

یہ آرڈر جب صادق آباد کے پرنسپل صاحب کو موصول ہوئے تو انھوں نے مجھے مبارک باد کا خط لکھا اور ساتھ ہی لکھا کہ اگر آپ یہ مشکل ترین اور ناقابلِ یقین ٹرانسفر کروا سکتے ہیں تو اپنی جگہ کسی اور استاد کا بندوبست بھی کروا سکتے ہیں، بصورتِ دیگر میں آپ کو بالکل ریلیو نہیں کروں گا۔ میں نے جوابی خط میں ان کی مبارک باد کا شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ بڑی مشکل سے یہ ٹرانسفر ہوئی ہے اب آپ مہربانی فرمائیں اور مجھے بتائیں کہ میں کب ریلیو ہونے کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوں۔ اُن کا جواب آیا کہ یا تو اپنا متبادل مہیا کریں یا انتظار کریں، تیسرا کوئی راستہ نہیں۔

اور اس طرح ایک بار پھر ''ان ت ظا ر'' میرا اور میں انتظار کا منتظر تھا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ مجھے آٹھ سال پہلے کی موسمِ گرما کی اسی طرح کی تعطیلات یاد آ گئیں جب مجھے ایک مقامی اسکول سے ریلیو ہونے اور دوسرے مقامی

اسکول تک جانے میں پورے دو ماہ لگ گئے تھے۔ وہ تو صرف ایک شہر اور ایک شہر میں بھی چند کلومیٹر کا معاملہ تھا اور اَب......! اَب تو ایک دوسرے سے آٹھ سو کلومیٹر دور دو شہروں کی طویل فصیل عبور کرنی تھی۔ اب انتظار نہ جانے کتنے طویل ہو!

صادق آباد کے پرنسپل صاحب نے فرمایا تھا کہ اپنا متبادل مہیا کرنے یا انتظار کرنے کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں لیکن اِس طویل انتظار کے دوران ہی قدرتِ خداوندی نے مجھے تیسرا راستہ بھی دکھا دیا۔ اور وہ تھا ارحم الراحمین اللہ اور مسبب الاسباب اللہ کی بارگاہ میں عرضی گزارنا۔

میری والدہ محترمہ اُس وقت حیات تھیں۔ کبھی اُمید اور کبھی مایوسی و بے بسی کی میری کیفیات اُن کے سامنے تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اُن کے ہونٹ ہلنے لگتے تھے اور میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ یقیناً میرے بارے میں ہی اللہ تعالیٰ سے چپکے چپکے باتیں کر رہی ہیں، اور پھر ایک دن جب میں نمازِ اشراق کے بعد جائے نماز پر بیٹھا اپنے مہربان رب کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا کر سورۃ المؤمن آیت ۴۴

وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ

کا وِرد کر رہا تھا تو پلنگ پر بیٹھی میری والدہ محترمہ نے اپنی گود میں موجود اپنے ڈیڑھ سالہ پوتے محمود اشرف کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بلند کر دیے۔

میں نے جب آمین کہتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرے تو میری نظر اچانک اِس پاکیزہ منظر پر جا پڑی۔ میرے دل سے آواز آئی کہ ہم تین نسلوں کی فریاد یقیناً اللہ رب العزت نے سن لی ہوگی اور یہ بہت جلد ایک اچھی خبر بن کر ہمارے سامنے آئے گی۔

ابھی تین دن نہیں گزرے تھے کہ مجھے صادق آباد کے پرنسپل صاحب کا خط گھر کے پتے پر موصول ہوا جس میں اُن کی مختصر سی تحریر تھی۔

”آپ ریلیو ہونے کے لیے یہاں آنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ آپ کا ریلیونگ آرڈر منسلک ہے۔ آپ مری کالج جا کر جوائن کر لیں۔ آپ کو بہت مبارک ہو!“

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

لیکن دعاؤں کا اتنا جلدی اور اتنا غیر معمولی اثر اس خط کی صورت میں روزِ روشن کی طرح میرے سامنے موجود تھا۔ اصولی طور پر تو ریلیو ہونے کے لیے مجھے صادق آباد کالج جا کر پہلے مختلف شعبوں سے لین دین اور حساب کتاب صاف کروانا چاہیے تھا جسے دفتری اصطلاح میں کے لیے کلیرنس (Clearance) کہتے ہیں مثلاً لائبریری، لیبارٹری، اکاؤنٹس، اسپورٹس، اسپتال وغیرہ۔ اس کے بعد میرے ریلیونگ آرڈر تیار ہونے تھے لیکن اتنے طویل اور کٹھن سفر اور ان تمام لوازمات کے بغیر گھر بیٹھے ریلیونگ آرڈر مل جانا اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہی ہو سکتی تھی۔

میں بارگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کیے بغیر نہ رہ سکا۔

بعد میں کالج کلرک جناب سراج احمد رحمانی نے اِس انہونی کے ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ پرنسپل صاحب کو آپ کی طرف سے ریلیو کرنے کے لیے جب خط موصول ہوا تو اس کے دو دن بعد ملتان میں تعینات ایک لیکچرر پرنسپل صاحب سے آ کر ملے۔ انھوں نے بتایا کہ میرا اسی علاقے سے تعلق ہے اور میں یہاں آنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے ڈی او لیٹر دے دیں۔ پرنسپل صاحب نے اسے ڈی او لیٹر دے دیا اور ساتھ ہی مجھے کہا کہ بیگ صاحب کی ریلیونگ کے لیے کلیرنس فارم مکمل کروائیں۔ انھوں نے آپ کی غیر موجودگی ہی میں آپ کی مختلف شعبوں سے کلیرنس مکمل کروائیں۔ چونکہ آپ کے ذمے کسی کا کچھ واجب الادا نہیں تھا اس لیے انھوں نے آپ کا ریلیونگ آرڈر مجھ سے تیار کروایا اور اپنے دستخط کر کے اُسی دن آپ کو رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کر دیا۔

یوں گھر بیٹھے مجھے میرا گوہرِ مقصود مل گیا۔

☆......☆

دوسرے دن ۶ / اگست ۱۹۸۰ء کی ایک روشن صبح جب میں اپنے نئے کالج جوائن کرنے کے لیے ویگن پر سوار ہو کر مری جا رہا تھا تو جوں جوں ویگن پہاڑیوں کی بلندی طے کر رہی تھی، گرم ہواؤں کی جگہ سرد ہوائیں لے رہی تھیں۔ ایسے میں مجھے صادق آباد میں قیام اور صادق آباد کے طویل سفر کے گرم لُو کے تھپیڑے بھی یاد آ رہے تھے۔ تین ماہ پہلے ۲۹، ۳۰ اپریل کا وہ طویل سفر میرے لیے جتنا کٹھن، جتنا تھکن سے بھرپور اور جتنا تکلیف دہ تھا، آج کا مختصر سفر مجھے اُتنا ہی آسان، سہانا اور رُوح افزا لگ رہا تھا۔ خوش نما مناظر میرا استقبال کر رہے تھے۔ سرسبز و شاداب پہاڑ، سرو قد درخت، پھولوں اور پھلوں سے ڈھکے ہوئے پودے نگاہوں کو تراوٹ بخش رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں ٹھنڈی ہواؤں میں اُڑتا ہوا بلندیوں کو چھو رہا ہوں۔

اِن بلندیوں میں اُڑتے ہوئے مجھے راولپنڈی کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے مہربان ہیڈ ماسٹر صاحب کا یہ جملہ رہ رہ کر یاد آ رہا تھا:

”کامیابی، ترقی اور بلندی کی منازل گھر بیٹھ کر بادام اور کاجو کھانے سے نہیں بلکہ باہر کے دھکے اور ٹھوکریں کھانے سے طے ہوتی ہیں۔“

دو تین سال بھی نہیں بلکہ صرف تین ماہ بعد ہی اس جملے کی صداقت میرے سامنے روزِ روشن کی طرح موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ناممکنات کا یہ طویل سفر مجھ سے صرف تین ماہ کے مختصر عرصے میں طے کرا دیا تھا جبکہ صادق آباد میں عملی طور پر مجھے پندرہ دن ہی رہنا پڑا۔

اس عظیم اور دُور اندیش ہستی کے لیے میرے دل سے دعائیں نکل رہی تھیں۔

☆☆☆

حکم محکم

عباسی خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں ایک شخص جرم کر کے فرار ہو گیا۔ مجرم کے بھائی کو گرفتار کر کے خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ مامون نے حکم دیا کہ اپنے بھائی کو پیش کرو ورنہ بھائی کے بدلے تم کو قتل کیا جائے گا۔

مجرم کے بھائی نے کہا: ”اگر آپ کا رندہ مجھے مارنا چاہے اور آپ کا حکم پہنچے کہ اسے چھوڑ دو تو آپ کا کارندہ چھوڑ دے گا یا نہیں؟“

ماموں نے کہا بے شک چھوڑ دے گا۔

اس نے کہا پس میں ایسے بادشاہ کا حکم لایا ہوں جس کی عنایت سے آپ بادشاہ ہیں۔ خداوند کریم قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں جس کا مفہوم ہے کہ ”یعنی کوئی شخص کسی کا گناہ نہیں اٹھاتا ہے کسی کو کسی دوسرے کے گناہ میں گرفتار نہ کرو۔“

مامون نے اس سے متاثر ہو کر حکم دیا کہ اسے رہا کر دیا جائے کیونکہ حکم محکم لایا ہے یعنی خدا تعالیٰ کا حکم لایا ہے۔

انتخاب: سیدہ صفیہ واسطی کراچی

اصلی والے ابا

ڈاکٹر سارہ الیاس

اِس چھوٹے سے شہر میں پھرتے پھراتے اگر آپ کو دو پیاری سی پٹ پٹ آنکھیں بند کھلی کرتی لال لال گالوں اور کس کر بندھی دو پونیوں والی گڑیاں نظر آئیں تو سمجھ جایئے گا کہ یہ شکیل میاں کی لاڈلی اور جڑواں بہنیں ہیں۔

ناجی نا! جتنی شریف اور مسکین سی لگ رہی ہیں ایسی بالکل نہیں تھیں کچھ عرصہ پہلے تک۔

کیا پوچھا؟ کیسی تھیں؟ ابھی بتاتے ہیں:

''اف اللہ! تم دونوں نے اکٹھے آ کر بھی بڑی شرارت کی ایک کو سنبھالنا آسان نہیں دوسری الگ مسئلے کھڑی کر رہی ہے؟'' یہ شفیقہ خالہ تھیں۔

چوچو ان کی نازوں پلی بلی کو، جو خاص طور پر پکا قیمہ کھانے کی عادی تھی، چوہے پکڑنا سکھا رہی تھی اور اس کوشش میں تین پلیٹیں اور دو گلاس توڑ چکی تھی۔ اس کو ڈانٹ کر زبردستی کمرے میں لائیں تو دیکھا کہ منی ان کی ایک ماہ کی بیٹی کو برف کا ٹھنڈا میٹھا گولا چٹوا رہی تھی۔

''خالہ! خالہ! اسے گرمی لگ رہی تھی۔''

بڑے اعتماد سے توتلی زبان میں معلومات خالہ کو دینے لگی تو انھوں نے سر پکڑ لیا۔

ننھے بے چارے کی الگ جان عذاب میں ہے، کبھی مکوڑا پکڑ کر اسے ڈرا رہی ہوتیں تو کبھی قینچی پکڑ کر اس کی حجامت شروع، اور کچھ نہیں تو 'میرا بھائی ہے'، نہیں میرا بھائی ہے' کے مسئلے پر معصوم کو کھینچنے لگتی ہیں۔

دادو اپنی عینک اور تسبیح ڈھونڈتی پھر رہی تھیں، مل کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ کافی دیر بعد اِن دونوں پر نظر پڑی تو ایک عینک لگا کر اِدھر اُدھر ٹکراتی پھر رہی تھی، دوسری تسبیح کو مالا کی طرح گلے میں لٹکا گول گول گھوم رہی تھی، اتنے میں باورچی خانے سے امی کی آواز آئی:

''ننھے کے لیے دودھ رکھا تھا ابال کر، دو منٹ میں پھٹ گیا۔''

دونوں کھی کھی کرنے لگیں۔

''ہم نے لیموں نچوڑا تھا تا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔''

امی نے کس کر ایک ایک لگائی تو روتے دھوتے کونے میں گھس گئیں:

''ہمیں کوئی پیار نہیں کرتا۔ امی بھی ننھے کی ہیں بس، ہم تو سوتیلے ہیں۔''

بس اس دن سے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی اور اسکول سے آ کر اپنے اصل امی ابو کی تلاش کا کام شروع کر دیا۔

بس یہیں سے اس کایا پلٹ کا آغاز ہوتا ہے۔

دن رات جب موقع ملتا گلیوں میں نکل جاتیں۔ اِدھر اُدھر اپنے اصلی امی ابو کی تلاش شروع کر دیتیں۔ بڑے سب سمجھا سمجھا کر تھک گئے مگر وہ بھی چوچو، منی تھیں، کیسے مان جاتیں۔ ایک دن بھری دوپہر میں سنسان گلیوں میں پھرتے ہوئے جب وہ تھک گئیں تو ایک پیڑ کے نیچے جا بیٹھیں۔ پہلے تو جیبوں میں سے کھانے پینے کا سامان نکال کر کھانے لگیں پھر اداس سی ہو کر بیٹھ گئیں۔

''چوچو! آخر کب تک ہم غیروں پر بوجھ بن کر رہیں گے۔''

''منی! ہم اپنے اصلی اور پکے والے امی ابو کہاں ڈھونڈیں؟''

''میری نجو اور رجو! کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے تمھیں، جانے وہ ظالم لوگ تمھیں لے کر کہاں چلے گئے تھے۔''

اچانک پیڑ کے پیچھے سے ایک آواز آئی اور ایک شخص اُن کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

وہ ایک فقیر تھا۔ اس نے انھیں گلے سے لگایا تو بدبو برداشت کرنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ اس نے انھیں بتایا کہ وہ جڑواں پیدا ہوئی تھیں، ایک دن ایک امیر کبیر آدمی ان کے گھر آیا۔ اس نے اسے کسی کام کے بہانے سے باہر بھیجا پھر اس کی بیوی سے بچیاں چھین کر غائب ہو گیا۔ ان کی ماں اس غم میں رو رو کر مر چکی ہے۔

اپنی ماں کی وفات کا سن کر وہ بہت روئیں اور اس کے ساتھ چل پڑیں۔

وہ ٹوٹا پھوٹا ایک گھر تھا۔ گندے میلے کچیلے برتنوں میں ان کے سامنے کھانا رکھ کر وہ باہر چلا گیا۔ یہ کھانا وہ کھا نہیں سکتی تھیں مگر اپنے دکھی ابا کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتی تھیں چنانچہ اسے کہیں چھپانے کے خیال سے وہ باہر نکلیں جہاں اُن کا غریب ابا ایک مہنگے ماڈل کے موبائل پر کہہ رہا تھا: ''شیخ سے بات کرو! اونٹ ریس کے لیے دو بچیاں ملی ہیں دو دو لاکھ سے ایک روپیہ کم نہیں۔''

اُن کے تو پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔

''اللہ جی! ایک بار امی کے پاس پہنچا دے پھر ہم اچھی بچیاں بن کر رہیں گی۔''

دونوں نے دعا مانگی اور چپ چاپ کمرے میں واپس جا کر بیٹھ گئیں۔

ان کا ابا گھر کا دروازہ باہر سے بند کر کے کہیں چلا گیا تھا۔ اب چوچو اور منی نے اپنی ہمتوں کو جمع کیا اور اِدھر اُدھر پھر کر گھر میں ایک سیڑھی تلاش کی۔

پھر چھت کے ذریعے وہ ہمسائے میں ویران پڑے ایک گھر میں اتر گئیں۔

خوش قسمتی سے اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا سو دونوں سر پر پیر رکھ کر وہاں سے بھاگیں۔

راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے رات کو کہیں جا کر گھر پہنچیں۔

اُدھر ان کی امی رو رو کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ دادو کا الگ برا حال تھا، ابا فون پکڑے نجانے کن کن لوگوں سے بات کر رہے تھے اور ننھا حلق پھاڑ پھاڑ کر چلاّئے جا رہا تھا۔

''چوچو منی! چوچو منی!''

انھیں دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔

انھوں نے سب سے معافی مانگی۔ ابا نے پولیس کو فون کر کے ان کی واپسی کی ساری کہانی سنائی۔ ان کی نشاندہی پر اُس ''اصلی پکے ابا'' کو اس وقت پکڑ لیا گیا جب وہ صبح ان کے لیے ناشتہ لے کر آیا تھا۔

خیر وہ دن اور آج کا دن چوچو اور منی بہت اچھی بچیاں بن گئی ہیں، کیوں کہ انھیں یقین آ گیا ہے کہ ماں باپ اولاد کے بھلے کے لیے ہی ڈانٹتے ہیں۔

☆☆☆

اٹلانٹس پبلکیشنز | محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز کے ناول

ویب سائٹ سے آرڈر کا طریقہ: www.atlantispublications.com.pk سے گھر بیٹھے ناول منگوائیں

اشتیاق احمد کے ناول اور دیگر کتابیں آرڈر کرنے کے لئے ویب سائٹ کے ہوم پیج کے اوپر BOOK SHELF پر کلک کریں اور پھر اپنی پسند کی کیٹگری پر کلک کریں، اپنی مطلوبہ کتاب کے ٹائٹل کے ساتھ ADD TO CART کے بٹن پر کلک کرتے جائیں، آپ اوپر دائیں کونے پر باسکٹ کے نشان پر اپنی منتخب کردہ کتب کی کل قیمت دیکھ سکتے ہیں۔ آرڈر فائنل کرنے کے لئے اس باسکٹ کے نشان پر کلک کر کے ایک مرتبہ رعایتی بل اور ڈلیوری چارجز دیکھ کر CHECKOUT کے بٹن پر کلک کردیں۔ اپنا مکمل نام، مکمل پتہ اور رابطہ نمبر کی مکمل تفصیلات درج کر کے NEXT پر کلک کریں۔ ادائیگی کے طریقوں میں سے ایک کا انتخاب کر کے PLACE ORDER پر کلک کردیں۔ آپ کا آرڈر ہمیں موصول ہوجائے گا۔ کال کنفرمیشن کے بعد آپ کا پارسل تین سے سات روز میں ڈلیور ہوجائے گا۔ واٹس ایپ میسج 0348-2568546 | فون 0331-4853445, 0300-2472238

آپ اپنے پسندیدہ ناول facebook.com/InspectorJamshed اور facebook.com/atlantispublications سے بھی آرڈر کرسکتے ہیں۔

ناولوں کے پہلے ایڈیشنز کے نئے پرنٹ، اوریجنل سرورق، اشتہارات اور بچوں کے خطوط کے ساتھ

انھیں الوداع کہیے

ظفر شمیم

حیوانات اس دھرتی کا حسن اور نظام قدرت کو اعتدال سے چلانے کا سبب ہیں۔ انسان نے اب تک ان سے بے پناہ فائدہ اٹھایا لیکن اب وہ جانور جو کرہ ارض کا سرمایہ تھے انھیں الوداع کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ جا رہے ہیں۔

سنگاپور کے قریب ۲۰۰۷ء میں وائلڈ لائف پولیس نے ایک مشکوک بحری جہاز کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مجرموں نے جلد ہتھیار ڈال دیے۔ کیمرون سے آنے والے اس بحری جہاز کی تلاشی میں ہاتھی دانت، گینڈوں کے سینگ، اناکونڈا سانپ کی کھالیں اور بہت سے دوسرے جانوروں کے اعضاء سے بھری ایک بہت بڑی کھیپ ہاتھ آئی جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ صرف ہاتھی دانت سے بھرے ہوئے کنٹینروں کا تخمینہ لگانے پر یہ انکشاف ہوا کہ انھیں حاصل کرنے کے لیے چار ہزار سے زائد ہاتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ خاص طور پر عکاپی گوریلے کی ہڈیاں اور کھالیں برآمد ہونے پر عالمی تنظیمیں دل تھام کر رہ گئیں، کیونکہ دو سال قبل ہی جانوروں کے حقوق کی عالمی تنظیم (IUCN) نے جلد معدوم ہوجانے والے جانوروں کی فہرست میں اس کا نام سب سے اوپر درج کیا تھا۔ اس کے بعد کی تحقیقات نے ساری دنیا کو چونکا دیا۔ اتنے بڑے پیمانے پر جانوروں کے اعضاء کی اسمگلنگ کسی معمولی گروہ کا کام نہیں۔ اتنے زیادہ جانوروں کی ہلاکت غیر قانونی شکار کرنے والے گروہ کی طاقت، وسائل اور اثر ورسوخ کی جانب واضح اشارہ ہے۔

اس وقت جانوروں کے اعضاء کی خرید وفروخت کی سب سے بڑی منڈی چین میں اور دوسری امریکا میں ہے۔ عالمی منڈی میں ہاتھی دانت ۲۴ ہزار روپے فی پاؤنڈ کے حساب سے فروخت ہوتا ہے اور چیتے کی کھال کی قیمت چھ سے آٹھ لاکھ روپے ہے۔ اسی طرح دیگر جانوروں کے اعضاء کی قیمتیں بھی بہت زیادہ ہیں۔ آج کل دنیا میں یہ غیر قانونی دھندہ سخت پابندیوں کے باوجود عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں جدید اسلحے سے لیس مجرم سوڈان کی حدود میں رنگے ہاتھوں شکار کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے جنہیں سخت سزا دی گئی مگر اصل مالکان پھر بھی پس پردہ رہے۔ چند لالچی انسانوں کے ہاتھوں فطرت کا حسن برباد ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے بھی کبوتر کی نایاب نسل مسافر ۱۹۳۵ء میں اور ڈوڈو پرندہ ۱۹۱۴ء میں انسان کے ہاتھوں ختم ہو چکے ہیں۔

آپ کی معلومات کے لیے بتاتے چلیں کہ پرندوں کی ۱۲ فیصد انواع اس دنیا میں باقی بچی ہیں۔ باقی ۸۸ فیصد کے بارے میں ہماری معلومات کا تناسب صرف دو فیصد ہے۔

انسان نے اب بھی ہوش کے ناخن نہ لیے تو کرہ ارض کا توازن جو رفتہ رفتہ بگڑ رہا ہے، مزید تباہی لا سکتا ہے۔

انڈونیشیا کے جانور پہاڑی آنوا اور لولینڈ آنوا، ارجنٹائن کی پنک فیری، پاکستان کے بلوچستان بیئر، انڈیانا چمگادڑ، اور آسٹریلیا کے بینڈی کوٹ خرگوش جیسے نایاب جانوروں کو بھی انسان آئندہ سالوں میں ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دے گا۔

دنیا کے حسین جنگل رفتہ رفتہ خاموش ہوتے جا رہے ہیں اور اس کا ذمہ دار صرف اور صرف انسان ہے جو دنیا میں آتا ہے تو دولت کے ڈھیر جمع کرنے میں لگ جاتا ہے اور اسے یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ ایک دن اس نے بھی اس فانی دنیا کو ''الوداع'' کہنا ہے۔

☆☆☆

ہمّت کا پہاڑ ۴۶

راوی: سبحان انعام اللہ خان مرحوم — تحریر: رشید احمد منیب

وہ کہنے لگے، اس کا مطلب ہے کہ آپ آدھی بات سمجھ گئے ہیں تو ہم پوری کر دیتے ہیں۔ ہم آپ کے لیے ایک آفر لے کر آئے ہیں۔ ہمیں اپنے فوجیوں کو تربیت دینے کے لیے ماہرین کی تلاش ہے۔ ہم نے آپ کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ بہت سی باتوں کی تصدیق کی ہے۔ آپ ہمارے لیے ایک بہت اچھا ذریعہ بن سکتے ہیں، اس لیے اگر آپ قبول کرتے ہیں تو بتایئے، ہم بہت جلد آپ کا پاسپورٹ، ویزہ وغیرہ تیار کروا دیں گے۔ آپ کچھ عرصے مہمان کے طور پر ہمارے ساتھ رہیے، ہمارا ساتھ پسند آئے تو ہم آپ کو منہ مانگا معاوضہ بھی دیں گے، آپ کو اور آپ کے اہلِ خانہ کو تمام بچوں کو امریکن شہریت بھی ملے گی اور بہترین محلِ وقوع میں آپ کو گھر بھی دیا جائے گا جو کہ آپ کی ملکیت ہوگا۔

اُن کا خیال تھا کہ میں فوراً اِس آفر کو قبول کرلوں گا۔ میں نے پوچھا کہ آپ چائے پسند کریں گے یا کچھ اور؟

انھوں نے چائے کا کہا۔ جب چائے آ گئی اور وہ پینے لگے تو میں نے پوچھا کہ آپ کے پاس تو بہترین ماہرین موجود ہیں، آپ کیوں ایک پاکستانی سے اپنے فوجیوں کو تربیت دلانا چاہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ امریکی فوجیوں کو پہاڑوں پر لڑانے سے پہلے انھیں مشینوں کے بغیر جسمانی ورزشوں سے گزارنا چاہیے۔ ہماری معلومات کے مطابق آپ ان بہترین ماہرین میں شامل ہیں جو ہمارے فوجیوں کے لیے ایسا تربیتی پروگرام تیار بھی کر سکتے ہیں اور خود بھی تربیت دے سکتے ہیں، اس لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں کہا کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں دنیا کی اتنی بڑی فوج کے لیے ایک تربیتی پروگرام تیار کرسکوں لیکن میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا بہرحال آپ کا شکریہ۔ اس کے بعد جہاں تک بات ہے آپ کی آفر کی تو میں امریکا جائے بغیر ہی آپ کی پیش کش کو قبول کرنے سے معذرت کر رہا ہوں۔

میری بات سن کر وہ خاموش بیٹھے رہے۔

ایک نے کہا کہ کیا ہماری پیش کش مناسب نہیں ہے؟ اگر آپ اس کے علاوہ کچھ مراعات چاہتے ہیں تو وہ بھی بتا دیں۔

میں نے جواب دیا کہ نہیں، آپ نے بہت زبردست آفر کی ہے۔ میں اسے قبول کرلیتا لیکن میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں اپنا وطن، اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

انھوں نے چند لمحے سوچا، پھر کہنے لگے کہ کیا آپ کچھ شرائط کے ساتھ ہمارا مطالبہ تسلیم کرلیں گے؟ میں نے جواب دیا، دوستو! بات یہ ہے کہ اگر سعودی حکومت بھی مجھے بلوائے تو میں صرف اس شرط پر جاؤں گا کہ میری قبر مدینہ میں بنے گی۔ مدینہ منورہ کے علاوہ میری خواہش یہ ہے کہ میرا ملک اور میری مٹی ہی میرا آخری ٹھکانا بنے۔ میں اسی مٹی میں پیدا ہوا ہوں، میں نے تمام زندگی اپنے لوگوں کے ساتھ بسر کی ہے، میں اپنے آخری سانس اسی ہوا اور اسی فضا میں لینا چاہتا ہوں اور میں مرنے کے بعد بھی اسی مٹی میں رہنا چاہتا ہوں۔

میری بات سن کر وہ کہنے لگے کہ آپ کی بات ایک سچے محبِ وطن کی بات ہے۔ آپ ہماری آفر قبول کرلیتے تو ہمیں بہت خوشی ہوتی، بہرحال آپ سے مل کر اچھا لگا۔

یہ کہہ کر وہ رخصت ہوگئے۔

(جاری ہے)

گھر کا بڑا

اسماء شاکر عثمانی۔ امریکا

میری امی اپنے گھر میں سب سے بڑی تھیں۔ نانی اماں کو دیکھا گھر کی ہر بات امی کو بتاتی تھیں اور اُن سے مشورہ کر کے ہی کام کرتی تھیں۔ امی کے سب بہن بھائی امی کو بہت ہی عزت دیتے تھے۔ میں نے امی کو دیکھا کہ ہمیشہ اپنے بھائی بہن کی کسی بھی پریشانی ضرورت میں پیش پیش ہوتیں۔ ایک بار میں نے امی سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ جب وہ چھوٹی تھیں تو جیسے ہی چھوٹی بہن گھر آئی، امی نے یعنی نانی ماں کی ساری توجہ چھوٹی بہن کی طرف ہوگئی۔ وہ ہر وقت چھوٹی بیٹی کے کاموں میں لگی رہتیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے کام امی مجھ سے کرواتیں: ''ثناء منی کا منہ صاف کرو، ثناء منی کا دودھ بنا دو، ثناء منی کو دیکھو کیوں رو رہی ہے؟''

ایک دفعہ منی روتے روتے گر گئی تو امی کی ڈانٹ پڑی کہ تم نے دیکھا کیوں نہیں؟

پھر گھر میں چھوٹا منا آ گیا۔ اب امی کی ذمے داریاں بڑھ گئیں۔ اب منی کے ساتھ ساتھ میری ذمے داریوں میں منا بھی آ گیا: ''ثناء منا کیوں رو رہا ہے دیکھو ذرا، ثناء چھوٹی کی ناک بہہ رہی ہے پونچھ دو، ثناء دیکھو منی نے سارا بسکٹ زمین پر گرا دیا صاف کرو!''

پھر منی یا منے سے کچھ غلط ہوجاتا تو امی مجھے ہی کہتیں کہ تم کو دیکھنا چاہیے تھا وغیرہ! اس وقت مجھے لگتا کہ مجھے بڑا ہونے کی سزا مل رہی ہے۔

ایک دن منی کو بخار تھا۔ وہ بہت رو رہی تھی۔ امی اس کو بہلا رہی تھیں مگر وہ کسی طرح چپ ہی نہیں ہو رہی تھی، جب مجھ سے اس کا رونا برداشت نہ ہوا تو منی کو میں نے گود میں لے لیا۔ میرے پاس آتے ہی منی خاموش ہوگئی اور کچھ ہی دیر میں میرے سینے پر سر رکھ کر سو گئی۔ تب پہلی بار مجھے منی پر دل سے پیار آیا۔ امی ابو بھی کہنے لگے کہ دیکھو ثنا کے پاس جا کر کیسا سکون سے سو گئی۔

بس پھر اپنے بہن بھائیوں کے کام کر کے اچھا لگنے لگا۔ منا جب شرارت کرتا، امی سے ضد کرتا تو امی کہتیں ثنا تم ہی اسے سمجھاؤ یہ تمھاری سنتا ہے۔ منی اپنے کام مجھ سے کہتی۔ اسے جب چوٹ لگتی میرے پاس ہی دوڑی آتی۔ اب مجھے بڑا ہونا بہت اچھا اور نعمت لگنے لگا۔

اب جب چھوٹے بہن بھائی مجھ سے محبت و عزت سے پیش آتے ہیں، مجھے ماں جیسا مان دیتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے لیے دل سے اچھا کرتے ہیں تو کوئی کام بوجھ اور سزا نہیں لگتا مگر زبردستی، بددلی سے کیے کام اور ذمے داریاں بوجھ اور سزا ہی لگتی ہیں۔

ویسے آپ کو بتاؤں میں خود بھی گھر کی بڑی ہوں مگر آج تک میرے پاس چھوٹا بہن بھائی نہیں ہے تو میں ہی چھوٹی ہوں۔ اس طرح مجھے کوئی غم یا فکر نہیں مگر گھر کی اکلوتی ہوں تو مما بابا کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال کر کے کام کر کے مجھے اپنا وجود ایک نعمت لگتا ہے۔

تو خیر بچو! بتایئے! آپ گھر میں بڑے ہیں یا چھوٹے؟

☆☆☆

پرچم سلسلہ 17

روس کے رنگ

روس کے جھنڈے کے تین رنگوں کی اپنی کہانی ہے۔سوویت یونین کے ہتھوڑی اور درانتی والے جھنڈے کے ختم ہو جانے کے بعد کمیونسٹ دور سے پہلے کے رنگ واپس آئے تھے اور یہ پیٹر اعظم کے تھے۔پیٹر اعظم نے یورپ میں سفر کیا تھا۔انھیں نیدرلینڈز کے تین رنگ پسند آئے تھے اور اپنا جھنڈا انہی پر بنایا تھا۔

اس کو 1858 میں الیگزینڈر دوئم نے تبدیل کیا۔1881 میں ہونے والے دہشتگردی کے حملے میں بادشاہ کے مارے جانے کے بعد واپس پیٹر کے رنگ آ گئے اور یہ 1917 تک رہے، پھر بالشویک انقلاب آ گیا۔

ہتھوڑی اور درانتی والا سرخ جھنڈا کارل مارکس کی زندگی میں نہیں تھا۔یہ بالشویک تحریک کے طاقت میں آ جانے کے بعد آیا۔نئے نظام کو پچھلی علامتیں روند کر پھینکنا ہوتی ہیں اور روسی جھنڈا ایسی علامت تھا جسے تبدیل کیے جانا تھا۔

پیرس میں ہونے والے بغاوت اور 1871 میں بننے والی سوشلسٹ حکومت نے سرخ رنگ استعمال کیا تھا اور اس کے بعد سے یہ انقلابی تحریک کا رنگ بن گیا تھا۔اسے بغاوت کی راہ میں خون دینے والوں کی یاد کا رنگ کہا جاتا تھا۔

ابتدائی برسوں میں ہتھوڑی اور درانتی کے ساتھ گندم کے خوشے بنے ہوتے تھے لیکن 1923 میں گندم کو نکال دیا گیا۔

☆☆

وہ ممالک جنھوں نے سوویت قبضے کی تکلیفیں برداشت کی ہیں، انھوں نے ہتھوڑی اور درانتی والے نشان ممنوع کر دیے ہیں، کیونکہ ان کے مطابق یہ ظلم، جبر، تشدد، غربت اور آمریت کی علامت ہے۔تاہم دلچسپ چیز یہ ہے کہ وہ ممالک جہاں کمیونزم نہیں رہا، وہاں کے نوجوانوں میں ابھی بھی اشتراکیت بطور آئیڈیل ایک چھوٹی تعداد میں ابھی بھی ملتا ہے۔

خود روس کے اندر اب یہ باقی نہیں رہا۔کئی بار مظاہروں میں یہ دکھائی دیتا ہے۔لیکن، اسے پرانے ”بابوں کی یاد“ کہا جاتا ہے۔

☆☆

روس کا اپنی سابق ریاستوں پر اثر ہے جس باعث روس کے تین رنگ ان میں نظر آتے ہیں۔اور یہ سلاو آبادی کی یکجائی کی علامت بھی بن گئے ہیں۔

سروہارا امباکر

انسانی جسم سے متعلق 12 حیرت انگیز حقائق

انسانی جسم حقیقت میں ایک حیرت کدہ ہے۔اس حیرت کدے کے بارے میں بہت سی باتیں ہم ابھی تک نہیں جان پائے لیکن جو کچھ جانتے ہیں وہ بھی ہمیں حیران کرنے کے لیے کچھ کم نہیں۔ذیل میں انسانی جسم کے چند ایسے حیرت انگیز حقائق ہیں جو آپ کو حیران کر دیں گے:

۱۔معدے میں غذا کو ہضم کرنے والا تیزاب اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ زنک کو پگھلا دے۔قدرت کا کرنا یہ ہے کہ ہمارے معدے کی اندرونی تہہ کے خلیے اتنی تیزی سے خستگی کے بعد دوبارہ بنتے ہیں کہ اس تیزاب کو معدے کو پگھلانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔

۲۔پھیپھڑے میں تین لاکھ ملین انتہائی باریک خون کی نالیاں ہوتی ہیں۔انھیں اگر ایک سیدھ میں ساتھ ساتھ جوڑا جائے تو ان کی لمبائی ۲۴۰۰ کلومیٹر یا ۱۵۰۰ میل ہو سکتی ہے۔

۳۔انسانی ہڈی وزن کی سپورٹ کرنے والے گرینائٹ جتنی مضبوط ہوتی ہے۔انسانی ہڈی کا ایک ماچس جتنا بلاک ۹ ٹن وزن کو سپورٹ کر سکتا ہے۔یہ کنکریٹ کے وزن سپورٹ کرنے کی حد سے ۴ گنا زیادہ ہے۔

۴۔ہر انگلی اور انگوٹھے کے ناخن پر چھ ماہ میں بنیاد سے نوک تک دوبارہ بڑھ سکتے ہیں۔

۵۔انسانی جسم میں سب سے بڑا اعضو انسانی جلد ہے۔بالغ انسان کی جلد 9.1 مربع میٹر یا ۲۰ مربع فٹ ہوتی ہے۔انسانی جلد جسم سے جھڑتی بھی رہتی ہے۔ایک انسان کی زندگی میں اس کی ۱۸ کلوگرام یا ۴۰ پاونڈ جلد جھڑتی ہے۔

۶۔جب آپ سوتے ہیں تو آپ کا قد تقریباً ۸ ملی میٹر یا 3.0 انچ بڑھ جاتا ہے اور اگلی صبح جب آپ جاگتے ہیں تو آپ کا قد سکڑ کر پہلے جتنا ہو جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی کرکری ہڈیاں کھڑے ہونے پر کشش ثقل کی وجہ سے اسفنج کی طرح سکڑ جاتی ہیں۔

۷۔عام طور پر ایک شخص اپنی زندگی میں ۵۰ ٹن خوراک کھاتا ہے اور ۵۰ ہزار لیٹر یا ۱۱ ہزار لیٹر مائع پی لیتا ہے۔

۸۔ہر انسانی گردے میں ۱ ملین انفرادی فلٹر ہوتے ہیں۔یہ ایک منٹ میں 3.1 لیٹر خون کو فلٹر کرتے ہیں اور ایک دن میں 4.1 لیٹر پیشاب خارج کرتے ہیں۔

۹۔انسانی آنکھ کے فوکس کرنے والے مسلز ایک دن میں ۱ لاکھ بار حرکت کرتے ہیں۔اگر آپ ایک دن میں ۸۰ کلومیٹر یا ۵۰ میل تک دوڑیں گے تو آپ کی ٹانگوں کے مسلز اتنی حرکت کر سکیں گے۔

۱۰۔۳۰ منٹ میں اوسط انسانی جسم سے اتنی زیادہ حرارت خارج ہوتی ہے کہ اگر اسے یکجا کر لیا جائے تو اس سے آدھا گیلن پانی ابالا جا سکتا ہے۔

۱۱۔ایک خون کے خلیے کو پورے جسم کا چکر لگانے میں ایک منٹ لگتا ہے۔

۱۲۔ہماری معلومات کا ۹۰ فیصد ہم آنکھوں سے دیکھ کر حاصل کرتے ہیں۔

☆☆☆

اخت عبدالحق۔لاہور

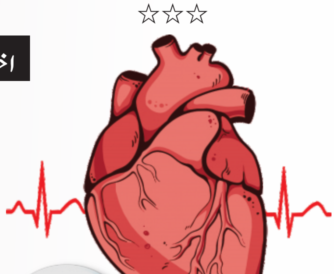

دس روپے

اُمِ محمد سلمان

شام بڑی سہانی تھی، ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اونچی اونچی عمارتوں کے عقب سے جھانکتی زرد سنہری دھوپ نے ماحول میں عجیب سی روشنی گھول دی تھی۔ رنگ برنگے آنچل میرے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ یہ ایک کافی بڑا اور معروف شاپنگ مال تھا جس کی بیرونی سیڑھیوں کے پاس کھڑی میں اپنے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ پارکنگ سے بائیک نکالنے گیا تھا۔ کمر درد کی وجہ سے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا سو سیڑھیوں کے پاس ہی ایک مناسب سی اونچی جگہ دیکھ کر میں بڑی تسلی سے بیٹھ گئی۔

ابھی ایک دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک تین چار سال کا بچہ میرے قریب آ کھڑا ہوا اور قدرے رازداری سے بولا: ''دس روپے دے دو!''

''ہائیں!'' میں اپنے خیالات سے بری طرح چونکی اور بنظرِ غائر اس کا جائزہ لیا۔

وہ بھکاری تو کہیں سے نہیں لگ رہا تھا۔ معصوم سا چہرہ، صاف کھلتا ہوا رنگ، گہرے کائی رنگ کی شلوار قمیص پہنے ہوئے خاموش سا میرے پاس کھڑا تھا۔

میں نے ایک بار پھر پوچھا: ''کیا کہا؟''

وہ پھر اسی رازداری سے بولا: ''دس روپے دے دو۔''

''لیکن میرے پاس تو دس روپے نہیں ہیں!''

میں نے بڑی سنجیدگی سے اسے جواب دیا، گویا ہم دونوں اس مصروف و معروف جگہ پر دس روپے کا معما حل کرنے ہی بیٹھے تھے۔

وہ کچھ دیر ادھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر وہی مطالبہ دہرایا: ''دس روپے دے دو!''

''لیکن میرے پاس دس روپے نہیں ہیں!''

میں نے اسی نرم اور ٹھنڈے سے لہجے میں جواب دیا۔

(اور حقیقتاً میرے پاس دس کا نوٹ تھا ہی نہیں)

وہ اپنے ایک ہاتھ کی انگلی پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے مسلنے لگا۔ گویا یہ اندرونی اضطراب تھا اور احتجاج بھی۔

''اچھا سنو! کیا تمھارے پاس دس روپے ہیں؟'' میں نے اسے متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہیں!''

اس نے اپنے کرتے کی بغل والی جیب کی طرف اشارہ کیا جو واقعی پھولی ہوئی تھی اور دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں کچھ نہ کچھ بھرا ہوا ہے۔

''ہمم! تو تم مجھے دس روپے دے دو!''

اُس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کیوں دے دوں؟

''دیکھو تمھارے پاس تو دس روپے ہیں ناں! لیکن میرے پاس نہیں ہیں، اس لیے تم مجھے دس روپے دے دو۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے بڑی حیرانی سے مجھے دیکھا اور اپنی جیب پر ہاتھ رکھ لیا۔ دل میں سوچ رہا ہوگا کہ یہ میں اتنی سی عمر میں کہاں پھنس گیا بھائی! ہپ نا کہ تو مجھے کچھ دینے کی بجائے الٹا مجھ سے مانگ رہی ہیں۔

میں چاہ رہی تھی وہ کچھ بولے لیکن اسے دس روپے مانگنے کے سوا شاید کچھ بھی نہیں سکھایا گیا تھا۔ میں اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی اور وہ میری نقاب سے جھانکتی آنکھوں کو۔ میں بڑے اطمینان سے اپنے گود میں رکھے پرس پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی اور میرے کسی بھی انداز سے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ میں اسے پرس سے پیسے نکال کر دینے والی ہوں! لیکن وہ پھر بھی میرے پاس کھڑا تھا، شاید یہ باجی بھی اسے اچھی لگ گئی تھی جیسے وہ مجھے اچھا لگ رہا تھا، اسی لیے وہ یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس نے پھر ایک موہوم سی کوشش کی اور اسی انداز میں بولا: ''دس روپے دے دو!''

''لیکن میرے پاس دس روپے نہیں ہیں نا!'' میں نے اسی ٹھہرے اور جمے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور ساتھ ہی اپنا مطالبہ بھی دہرا دیا۔

''تم مجھے دس روپے دے دو نا، میں چائے پیوں گی!'' میں نے ازراہِ تفنن مسکراتے ہوئے کہا۔

چائے کے نام پر اس نے مجھے پھر ایک بار چونک کر دیکھا اور دوبارہ اپنے ہاتھوں پر نظریں جما کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا ہوا وہ معصوم سا بچہ میرے دل میں گھر کر گیا۔ ''جی چاہا اٹھا کے گھر لے جاؤں اور خود ہی پال پوس کے بڑا کر دوں!

وہ میرے مسلسل انکار کے باوجود بھی پتا نہیں کیوں نہیں جا رہا تھا وہاں سے۔ شاید اسے یہ سکھایا گیا تھا کہ دس روپے لیے بغیر ہلنا نہیں شکار کے پاس سے۔ پھر اس نے اپنی ہتھیلی کے جائزے کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا اور میرے عقب میں کھڑی ڈولمن مال کی پرشکوہ عمارت کا جائزہ لینے لگا۔

لیکن اس معصوم کی نظریں اتنی اونچائی میں کہاں جا سکتی تھیں، سو تھوڑا سا سفر کر کے لوٹ

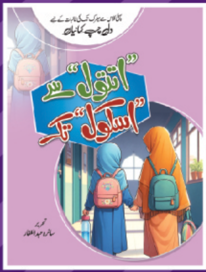

پہلی کلاس سے میٹرک تک کی طالبات کے لیے دل چسپ کہانیاں

- طالبات کے اخلاق و کردار سنوارنے والی بہترین تربیتی کہانیاں
- بچیوں کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت پر مشتمل جماعت وار کہانیاں
- ان کہانیوں میں بچیوں کے لیے دل چسپ کرداروں کے ذریعے راہ نمائی کی گئی ہے
- یہ کہانیاں بچیوں کی کردار سازی کے ساتھ ساتھ، ان کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں بھی معاون ہوں گی ان شاء اللہ تعالیٰ

بچوں کی درست سمت میں راہ نمائی کرتی کہانیاں

- بچوں کے ماہر نفسیات اور نامور لکھاری جناب ڈاکٹر عمران مشتاق صاحب کے قلم سے
- بچوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح دین و معاشرے پر مبنی سبق آموز کہانیوں کا مجموعہ
- بچوں میں یقین، حسن اخلاق، وعدہ نبھانا اور غلطی نہ دہرانا جیسی صفات پیدا کرنے والی خوب صورت کہانیاں
- یہ کہانیاں بچوں کے اخلاق و کردار کو سنوارنے اور ان میں اچھی عادات پیدا کرنے میں معاون ہوں گی ان شاء اللہ تعالیٰ

بیت العلم (الوقف)

خود بھی مطالعہ کیجیے اور متعلقین کو تحفے میں دے کر کتاب دوست بنائیے۔

کراچی، سندھ +92-309-2228082/89/94 لاہور، پنجاب +92-306-0142297 خیبر پختون خوا +92-309-2228078 بلوچستان +92-309-2228084

برائے تجاویز +92-322-2583196 گھر پر منگوانے کے لیے maktababaitulilm www.mbi.com.pk

آئیں۔ کتھئی رنگ کی سرخی مائل آنکھیں!

اس نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی آنکھوں میں۔ شاید وہ بھی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری آنکھیں بالکل سیاہ ہیں یا سیاہی مائل بھوری یا پھر کتھئی مائل سیاہ! یا پھر ہوسکتا ہے وہ میری آنکھوں میں دس کے نوٹ کی شبیہ ڈھونڈ رہا ہو یا پھر ہوسکتا ہے وہ میری آنکھوں میں کسی شفیق ماں کی ممتا اور مٹھاس ڈھونڈ رہا ہو، اور اس تیسرے خیال نے میرے دل کو دُکھ سے بھر دیا۔ نجانے کس کے آنگن کا پھول ہے؟ کس کی رات کا چراغ ہے کس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے؟ نجانے کس ماں کا لعل و گوہر ہے جو اس سے چھین کر یوں سڑکوں پر رلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے!

میرا حساس دل اندر سے رو دیا، پھر اس نے آگے کی طرف قدم بڑھائے۔ چھوٹے چھوٹے پیروں میں بدرنگ سی ربر کی چپل!

وہ شاید میری طرف سے مایوس ہو کر جانے لگا تھا اور اسی وقت میرے کانوں میں آواز سنائی دینے لگی: ''امی! امی!''

''ہائیں! یہ جاتے جاتے مجھے امی کیوں کہہ رہا ہے؟''

میں نے بے دھیانی میں سوچا۔

عین اسی وقت سلمان میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرانے لگا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا: ''امی! آپ ہمیشہ کی طرح نجانے کن سوچوں میں گم ہیں، میں آپ کو کب سے آواز دے رہا ہوں!''

''ہاں بیٹے چلتے ہیں۔''

میں اپنے خیالات کے بھنور سے بمشکل نکلی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے سہارا دیا اور بائیک تک لے آیا۔ راستے میں وہ مجھ سے پوچھنے لگا: ''امی! آپ اتنی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں، خیر تو تھی آج کیا ہوا؟'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی اماں بات بے بات سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتی ہیں۔

''کچھ نہیں بیٹا! بس وہ بچہ دس روپے مانگ رہا تھا لیکن میں نے دیے نہیں!''

''تو کیوں نہیں دیے امی؟ آپ دے دیتیں۔''

''یہی تو بات ہے بیٹا! پیسے ہی تو نہیں دینے تھے۔''

''لیکن کیوں امی؟''

''بیٹے ہم ان معصوم بچوں کی معصومیت پر ترس کھا کر دے دیتے ہیں تبھی تو سفاک لوگ کسی کا کلیجہ نوچ آتے ہیں اور مانگنے کے لیے راستوں پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ اگر ہم انھیں دینا بند کر دیں تو شاید ان معصوموں کو ماں سے باپ سے جدا بھی نہ کیا جائے۔ وہ وقت جو ماں کی گود میں کھیلنے اور کچھ پڑھنے لکھنے، سیکھنے اور تربیت کا ہوتا ہے، اس وقت یہ بھیک مانگنا سیکھ رہے ہوتے ہیں، در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہوتے ہیں، ہائے معصوم مظلوم بچے!''

میرا دل ایک بار پھر دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

اس بار محمد سلمان بھی گہری سوچ میں ڈوبتا ابھرتا خاموشی سے بائیک چلاتا رہا۔

☆☆☆

مصرع

استاد (شاگرد سے) ''اس شعر کا دوسرا مصرع بتاؤ:

''جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی۔''

شاگرد: ''اس کھیت میں فوراً ہی ٹیوب ویل لگا دو۔''

انتخاب: حسان انصاری۔ لودھراں

بابا حاجی مانک غازی!

حسان احمد۔ لودھراں

سنھ کے علاقہ ضلع نواب شاہ تحصیل پڈعیدن سے پندرہ میل دور ایک قصبہ آباد ہے۔ اس کا نام کونڈی ہے۔ اس قصبے میں کچھ مرزائی رہائش پذیر تھے۔ ۱۹۲۶ء کی بات ہے کھمر زائیوں نے مسلمانوں کو مناظرے کا چیلنج دے دیا۔

تحریک ختم نبوت والوں نے اپنے اکابر علماء کو دعوت دے کر بلایا اور مناظرے کی تیاری کر لی۔ حضرت مولانا لال حسین اختر رحمہ اللہ اور دیگر علمائے کرام تشریف لائے۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد بھی اس مناظرے کو دیکھنے کے لیے پہنچی ہوئی تھی۔

مناظرے کا آغاز ہوا اور مولانا لال حسین اختر صاحب رحمہ اللہ نے بڑے ہی جرأت مندانہ انداز میں فرمایا۔ آج میں ان شاء اللہ تعالیٰ ثابت کروں گا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کذاب تھا، اس کا دعویٰ نبوت بھی جھوٹا تھا اور ہے اور اس کے اوپر احکامات کا نزول ماننے والے اس کے پیروکار سب جھوٹے ہیں۔

علماء حق کے مقابلے میں جو قادیانی مناظر جو آیا تھا، وہ ایک مقامی جاگیر دار عبدالحق نامی شخص تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مرزا قادیانی کا جانشین نبی ہے۔ اس کی انگوٹھی پر ''عبدالحق نبی اللہ'' نقش تھا۔ اس بدبخت نے مولانا لال حسین اختر کے جواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں نہایت بدترین توہین کر دہی۔

بس پھر کیا تھا، مسلمان تو بپھر گئے۔ حاضرین نے اس پر حملہ کیا تو وہ بھاگ گیا۔

ہاں کے ایک رہائشی اور مرد مجاہد حاجی محمد مانک ان دنوں علاقے سے باہر تھے۔ واپس آئے تو ان کی والدہ محترمہ نے روتے ہوئے کہا:

''بیٹا میں تمھیں دودھ معاف نہ کروں گی کہ تمھارے ہوتے ہوئے ایسے لوگ موجود ہیں جو ہمارے ملجا و ماویٰ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں توہین کرتے ہیں۔''

ان کے استفسار پر بوڑھی ماں نے پورا واقعہ کہہ سنایا۔ آپ کو حج بیت اللہ کا بڑا ذوق تھا اور ان دنوں بھی آٹھویں حج کی تیاری میں مصروف تھے، مگر یہ دردناک حادثہ سن کر حج کا ارادہ منسوخ کر دیا۔

چنانچہ اس گستاخِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعاقب کیا اور روزہ کی حالت میں بڑی جدوجہد کے بعد اسے پکڑا اور جہنم رسید کر دیا۔ پھر اس کے منہ سے اس کی ناپاک زبان نکال کر ٹکڑے ٹکڑے کی اور کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گستاخی کرنے والوں کا حاجی مانک ہمیشہ یہی انجام کرتا رہے گا۔

یہی ہے رِسم وفا اور من چلوں کا شعار

آپ کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

متعلقہ پولیس افسر کی بیوی بڑی پاکباز، نیک سرشت اور عبادت گزار تھی۔ وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہر کی ٹھنڈی ہوا کے لیے ہمیشہ تڑپا کرتی تھی۔ ان کے والد ایک باعمل اور متقی عالم دین تھے۔ قصہ مختصر نصف شب کے قریب موصوفہ سو رہی تھیں کہ یکایک مقدر بیدار ہو گیا، خواب میں رسولِ پاک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا کہ حوالات میں ہمارا ایک مہمان آیا ہوا ہے، اس کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا۔

اس ایمان پرور واقعہ کے بعد پولیس کے رویہ میں نمایاں تبدیلی رونما ہو گئی۔ بابا حاجی مانک کو سکھر پولیس نے گاڑی میں بٹھایا اور سکھر جیل لے آئے۔

جیل میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں اس عاشق کی زیارت کے لیے آتے تھے اور جیل کے لوگ حاجی مانک کی خدمت کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ جب علماء کرام کو علم ہوا تو دور دور کا سفر کر کے حاجی مانک کی زیارت کے لیے تشریف لائے۔ ان میں مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ، مولانا قاضی احسان احمد صاحب رحمہ اللہ، شجاع آبادی رحمہ اللہ، حضرت امروٹی رحمہ اللہ، مولانا عبداللہ درخواستی رحمہ اللہ اور مولانا عبدالشکور دین پوری رحمہ اللہ قابلِ ذکر ہیں۔

تین سال مقدمہ چلنے کے بعد جج نے حاجی مانک کو بری کر دیا۔

حاجی مانک نے غازی کا لقب تو پا لیا مگر اس بات پر تاحیات افسوس رہا کہ شہادت کی موت نصیب نہ ہو سکی۔

بہر حال ۲ / اکتوبر ۱۹۸۳ء بروز ہفتہ چار بجے شام کے قریب آپ کا وصال ہوا۔

☆☆☆

تاریخ اسلام کا ایک ورق

نعیم الرشید۔ بہاولپور

''قاضی صاحب! سلطان نے میری زمین پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے, مجھے میرا حق دلایا جائے۔'' عدالت میں حاضر ہونے والے شخص نے دعوی کیا۔

قاضی نے اسی وقت سلطان کو عدالت میں طلب کر لیا...

عدالت کا قاصد سلطان کے پاس گیا، تاکہ اسے عدالت میں حاضری کا حکم سنایا جا سکے۔ سلطان نور الدین زنگی اس وقت چوگان کھیل رہا تھا۔ عدالت کا حکم اسے پڑھ کر سنایا گیا۔ وہ اسی وقت عدالت کی طرف چل پڑا۔ عدالت میں حاضر ہوا تو بولا۔

''قاضی صاحب! اس وقت میں سلطان کی حیثیت سے نہیں، ایک ایسے شخص کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوا ہوں جس پر دعویٰ دائر کیا گیا ہے، لہٰذا میرے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو مدعا علیہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔''

قاضی صاحب نے اسے مدعی کے پاس بیٹھنے کے لیے کہا، پھر عدالت کی کارروائی شروع کی گئی۔ اب دونوں طرف کی شہادتیں سنی گئیں اور آخر قاضی نے فیصلہ سنایا:

''زمین سلطان کی ثابت ہو گئی ہے، مدعی کا دعویٰ غلط ہے۔''

فیصلہ سننے کے بعد سلطان نے کہا:

''میں جانتا تھا مدعی کا دعویٰ جھوٹا ہے، اس کے باوجود میں عدالت میں حاضر ہو گیا تاکہ میرے بارے میں یہ خیال نہ کر لیا جائے کہ میں نے اس شخص پر ظلم کیا ہے اب جب کہ اس زمین پر عدالت کی طرف سے میرا حق ثابت ہو گیا ہے تو میں وہ زمین اس شخص کو دیتا ہوں۔''

☆☆☆

بھانڈا پھوٹ گیا

محمد فیصل علی

سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ باغات میں کھجوریں گرمی سے پک رہی تھیں ۔لوگ اپنے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ بازار میں خرید وفروخت کا عمل جاری تھا۔ زندگی رواں دواں تھی۔ جب سے اس شہر میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تھے تب سے ہر شے کا حسن بڑھ گیا تھا۔سکون،نورانیت اور امن کی ایک چادر پورے شہر پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

مسلمانوں کی خوشی تو دیدنی تھی۔ وہ تو کافی عرصے سے آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی راہ تک رہے تھے۔اب اُن کی آنکھیں ٹھنڈی اور سینے خوشی اور راحت سے بھر چکے تھے مگر ایک شخص ایسا تھا جس کا دل کینے اور نفرت کی سیاہی سے بھر چکا تھا اور اب وہ سیاہی اس کے چہرے پر بھی چھانے لگی تھی۔

وہ رات دن نفرت کی آگ میں جلتا رہتا تھا۔

یہ عبداللہ بن ابی تھا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے پہلے یہ مدینہ منورہ کے قبائل اوس وخزرج کا سردار بننے جارہا تھا۔اس کا شاہی تاج بھی تیار تھا مگر جیسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، اسے اپنی جھوٹی سرداری خطرے میں پڑتی نظر آنے لگی۔اس نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی تو آپ پر جان چھڑکتے ہیں،وہ مسلمانوں سے ٹکرا کر اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکتا تھا، چنانچہ اس نے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔اس نے زبان سے کلمہ پڑھ لیا مگر دل سے نہ پڑھا۔ دل میں کفر کے کانٹوں کو چھپائے رکھا۔اس کی سوچ یہ تھی کہ جب جب اسے موقع ملے گا، وہ مسلمانوں کو اندر سے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

اور بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ اس نے کئی مواقع پر اسلام اور مسلمانوں سے غداری کی۔مثلاً

۱۔غزوہ احد کے موقع پر اپنے ساتھیوں سمیت اسلامی لشکر سے الگ ہوگیا۔

۲۔مدینہ منورہ میں قومیت اور وطنیت کا نعرہ لگا کر انصار اور مہاجر صحابہ کو آپس میں لڑوانے کی کوشش۔

۳۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگانے میں پیش پیش رہا۔

۴۔یہودیوں سے مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں۔

عبداللہ بن ابی کا خیال تھا کہ میرے نفاق کا کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا مگر یہ اس کا غلط خیال تھا۔اللہ تعالیٰ نے تو اس کی اور دیگر منافقین کی ایک ایک نشانی قرآن وحدیث کے ذریعے بتادی تھی۔

ایک دن عبداللہ بن ابی بازار میں بیٹھا تھا کہ سامنے سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم آتے دکھائی دیے۔اس نے انھیں دیکھ کر ایک طنزیہ مسکان اچھالی اور اپنے ساتھیوں سے کہا:

’’دیکھنا، میں ان لوگوں کو کیسے بے وقوف بناتا ہوں۔‘‘

پھر جیسے ہی یہ صحابہ نزدیک آئے، وہ خوشامدانہ انداز میں آگے بڑھا اور ہر ایک سے اس کی خیریت پوچھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعریف کرنے لگا۔اس نے ہر ایک صحابی کا ہاتھ پکڑ کر دلجوئی والے انداز میں اس کی تعریف کی۔

’’اے ابوبکر! بنو تیم کے سردار، صاحب غار، اپنا جان مال لگانے والے! کیا کہنے آپ کے۔‘‘

’’اے عمر،خطاب کے بیٹے،حق وباطل میں فرق کرنے والے،مضبوط جوان۔‘‘

’’اے نبی کے چچازاد بھائی، بنوہاشم کے ہیرے،خوش آمدید۔‘‘

صحابہ کرامؓ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور آگے بڑھ گئے۔

جب وہ چلے گئے تو اس نے ہنس کر کہا:

’’دیکھو!میں نے انھیں کیسے بے وقوف بنایا، وہ مجھے اپنا بڑا خیر خواہ سمجھیں گے۔‘‘

اس کے ساتھی ہنسنے لگے۔اُدھر اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کے یہ سارے احوال پیارے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو بتادیے اور آپ نے اپنے صحابہ کو بتادیے۔منافقین کے متعلق درج ذیل آیات اتریں اور ان کا بھانڈا پھوڑ دیا گیا۔

سورت بقرہ کی درج ذیل آیات میں ان کا تذکرہ ہے:

سورت بقرہ آیت ۸:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّهِ وَبِالْيَوْمِ الآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ

ترجمہ: کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت ایمان لے آئے حالانکہ وہ حقیقت میں مومن نہیں ہیں۔

سورت بقرہ آیت ۱۴:

وَإِذَا لَقُواْ الَّذِينَ آمَنُواْ قَالُواْ آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْاْ إِلَى شَيَاطِينِهِمْ قَالُواْ إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ

ترجمہ:اور جب یہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب یہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں،ہم تو مذاق کر رہے تھے۔

☆☆☆

جواہرات سے قیمتی

☆کسی سے ملو تو اس طرح ملو کہ وہ دوبارہ آپ سے ملنے کی تمنا کرے۔

☆سب سے کمزور وہ ہے جو اپنا راز نہ چھپا سکے۔

☆نفرت جرم سے کرو مجرم سے نہیں۔

☆اعتماد محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔

☆اگر کسی کا دل جیتنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے اخلاق کو بلند کرو۔

☆اچھا نظر آنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اچھا بننے کی کوشش کرو۔

شاہد احمد۔کوئٹہ

☆☆☆

پریشان ہونا چھوڑو!

ماہر (سکلڈ) علماء کے پاس ہے
آپکی تمام مشکلات کا حل

کیا آپ آن لائن ٹیچنگ کرتے ہیں؟

کیا آپ اکیڈمی لانچ کرنا چاہتے ہیں؟

کیا آپ انتظامی مشکلات کا شکار ہیں؟

کیا آپ نا تجربہ کاری سے پریشان ہیں؟

کیا آپ کے پاس سٹوڈنٹس کی شدید کمی ہے؟

تو ماہر (سکلڈ) علماء کی ٹیم ہر مشکل میں آپ کے شانہ بشانہ کھڑی ہے۔

سکلڈ علماء

تمام مسائل کے یقینی حل کے لئے ابھی صرف ایک کال کیجئے۔

0320-0002047

Web: www.skilledulama.com

اشاعت دین کے ساتھ ساتھ معاشی فکروں سے بھی نجات حاصل کیجئے۔